

قرآنی طرز زندگی کے مطابق قیادت و رہبریت کی شرائط

ڈاکٹر زاہد علی زاہدی*

خلاصہ:

قرآن کریم اللہ کی آخری کتاب ہے جو کتاب ہدایت ہے اور انسان اور انسانی معاشرہ کو درپیش ہر قسم کے مسائل کے لیے اس کتاب میں ہدایت موجود ہے۔ معاشرے کی ایک اہم ضرورت قیادت و رہبریت بھی ہے لہذا اس سلسلے میں بھی قرآن کریم میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ اس مقالے کا مقصد قرآن کریم کی روشنی میں قرآنی طرز زندگی کے مطابق قیادت و رہبریت کی شرائط کو تلاش کرنا ہے۔ اس حوالے سے جب اس کتاب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو جا بجا ایسی آیات قرآنی نظر آتی ہیں جن میں امامت، قیادت اور رہبریت سے متعلق واضح شرائط سامنے آتی ہیں۔ اگر ان کا خلاصہ کیا جائے تو وہ پانچ قسموں میں تقسیم ہو سکتی ہیں۔ پہلی خصوصیت ایمان ہے جس کی ہر اہم ذمہ داری کے لیے لازمی ہے، دوسری خصوصیت علم ہے جس کے بغیر قرآن کے مطابق انسان ایسا ہے جیسا کہ نابینا، تیسری خصوصیت شجاعت اور شہامت ہے جو قیادت و رہبریت کے لیے از بس ضروری ہے، چوتھی خصوصیت حسن تدبیر ہے جس سے مراد اہلیت ہے جو کسی بھی ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے ضروری ہے اور پانچویں خصوصیت جو دراصل بہت سے خصوصیات کا مجموعہ ہے وہ ہے تقویٰ یعنی الٰہی قیادت و رہبریت کے لیے ان تمام شرائط کا ہونا ضروری ہے جو تقویٰ الٰہی کا تقاضہ ہے۔ اس میں عاجزی و انکساری، وسع القلبی، عدالت پسندی، اصول پسندی، صبر و شکیبائی اور بصیرت دینی وغیرہ شامل ہیں۔ گویا قرآن جس کو آتمہ ہدیٰ یعنی ہدایت کی طرف رہنمائی کرنے والی قیادت و رہبریت قرار دیتا ہے وہ ان تمام خوبیوں کا حامل ہوتا ہے جس ایک صاحب تقویٰ کے اندر ہونی چاہئے۔

کلیدی الفاظ: قیادت، رہبریت، امامت، سیاست، حکومت

قرآن کریم اللہ کی کتاب اور کتاب ہدایت ہے جس میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کے لیے وہ سب کچھ رکھ دیا ہے جس کی کسی بھی زمانے کے انسان کو ضرورت پڑ سکتی ہے نیز انسان ترقی کرتے ہوئے اگر مرتج پر بھی پہنچ جائے تو قرآن ہی اس کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے کوئی آسمانی کتاب نازل ہونے والی نہیں ہے۔ لہذا اسلامی تعلیمات کے مطابق انفرادی و اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے قرآن سے ہدایت حاصل کرنا ضروری ہے اور ہدایت کے حصول کے لیے اس کا پڑھنا، سمجھنا اور غور و فکر کرنا یعنی تدبر فی القرآن ضروری ہے۔

بعض سادہ لوح لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام فقط آخرت کے لیے ہدایت فراہم کرتا ہے اور حکومت، سیاست اور قیادت وغیرہ کے مسائل کا تعلق اسلام اور قرآن سے نہیں ہے حالانکہ دین اسلام ایک نظام زندگی ہے جس میں انسان اور انسانی معاشرے کے لیے ان تمام ہدایتوں کو جمع کر دیا گیا ہے جس کی ضرورت کسی بھی شعبہ حیات میں پڑ سکتی ہے یہاں تک کہ بیت الخلا میں بیٹھنے کے آداب بھی سکھائے گئے ہیں لہذا یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ معاشرے کی ایک انتہائی اہم ضرورت یعنی حکومت اور سیاست کے بارے میں کوئی ہدایت موجود نہ ہو اور جب حکومت اور سیاست کی بات کی جائے تو یہ ممکن نہیں کہ قیادت و رہبریت سے متعلق ہدایت قرآن میں موجود نہ ہو کیونکہ ریاست کا قیام اور اس کا انتظام و انصرام ایک لائق فائق اور صالح قیادت کے بغیر ممکن نہیں۔ جب ہم اس نقطہ نگاہ سے قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں جابجا ہدایات نظر آتی ہیں۔

اسلام سے قبل حجاز مقدس میں مرکزی قیادت کا کوئی تصور نہ تھا بلکہ قبائلی نظام رائج تھا جس میں ہر قبیلے کا سردار اس قبیلے کا قائد و رہبر سمجھا جاتا تھا تاہم قبیلہ کے سردار کا انتخاب بعض خوبیوں کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا تھا جن میں شجاعت، سخاوت اور علم کو اہمیت دی جاتی تھی البتہ اس کے باوجود لوگ ذاتی اثر و رسوخ کے سبب قبیلہ کا سردار بن جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے اپنے بنیاد نصاب یعنی قرآن کریم میں ان چیزوں کو جمع کر دیا ہے تاکہ ہر دور کے انسان ان سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے اپنے زمانے کے مطابق اہل افراد کو یہ بھاری ذمہ داری سونپ سکیں اور معاشرہ اپنے ارتقائی سفر طے کرتا ہوا کمال تک رسائی حاصل کرے۔

قرآن کریم میں سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۶۷ کو آیہ بلغ بھی کہتے ہیں کیونکہ اس میں خداوند عالم نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پیغام کو پہنچادیں جو پہلے ہی نازل ہو چکا ہے اور اگر یہ کام نہ کیا تو گو یارسالت

کا کوئی کام ہی انجام نہیں دیا۔ متعدد روایات کی روشنی میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہاں حضرت علیؑ کی ولایت کو پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا اسلامی معاشرے کی قیادت و رہبریت کا اعلان اس قدر اہم تھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ اگر یہ کام نہ ہوا تو گویا رسالت کا کوئی کام نہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ جس معاشرے کی بنیاد اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی نگرانی میں رکھی اور جس معاشرے کو زمانہ جاہلیت کے قبائلی نظام سے نکال کر مرکزی سیاسی نظام کی طرف لے کر آئے اس کی قیادت میں تسلسل ضروری تھا ورنہ امت کا شیرازہ بکھر جاتا۔ بعد کی تاریخ نے ثابت کیا کہ جب امت نے اعلان غدیر پر عمل نہیں کیا تو کس طرح اسلام کی پوسٹین الٹ گئی۔^۲

قرآن کریم میں واضح طور پر دو طرح کی قیادتوں کا تذکرہ ہے ایک کو آئمہ ہدیٰ کہا گیا ہے اور ارشاد ہوا کہ:

وَ جَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا^۳

جبکہ دوسرے کو آئمہ جور سے تعبیر کیا گیا ہے جو لوگوں کو جہنم کی آگ کی طرف لے کر جاتے ہیں:

وَ جَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ^۴

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دونوں طرح کی قیادتوں میں صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض صلاحیتیں مشترک بھی ہوتی ہیں تاہم آئمہ ہدیٰ معاشرے کو امر الہی کی طرف دعوت دیتے ہیں اور جو لوگ ان کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں انہیں اپنی قیادت و رہبریت میں خدا کی طرف لے جاتے ہیں جبکہ آئمہ جور لوگوں کو آگ یعنی نار جہنم کی دعوت دیتے ہیں اور جو ان کے پیچھے چلتا ہے وہ انہی کے ساتھ جہنم رسید ہو جاتا ہے۔ آئمہ ہدیٰ کے لیے لفظ یھدون آیا ہے جبکہ آئمہ جور کے لفظ يدعون آیا ہے جو کہ خود ان کی دعوتوں کی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

۱ 'يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (سورہ مائدہ ۶۷)

۲ پوسٹین الٹنے کی اصطلاح حضرت علیؑ نے اپنے خطبے میں استعمال کی ہے وُلِّسَ الْإِسْلَامُ لِبُنِّسِ الْقَوْمِ مَقْلُوبًا (صحیح البلاء،

خطبہ ۱۰۸)

۳ سورہ انبیاء ۷۳

۴ سورہ قصص ۴۱

قرآن کریم میں خدا سے برگشتہ کرنے والی قیادت کو طاعوت کا نام دیا گیا ہے جو کہ لفظ طغی سے نکلا ہے جس کا معنی طغیانی و سرکشی ہے گویا ایسی قیادت خود کو خدا کے مقابل قرار دیتی ہے اور معاشرے کو بھی خدا سے برگشتہ کرتی ہے اور انسان کو خدا کے احکام سے بغاوت پر اکساتی ہے۔ نتیجتاً انسان اور انسانی معاشرہ نور ہدایت سے نکل کر کفر و شرک کی گمراہی میں پہنچ جاتا ہے۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا
أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ^۱

قرآن کریم تو انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ایک مقصد اللہ کی عبادت اور طاعوت سے انکار کو قرار دیتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ^۲

لہذا الہی قیادت کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ معاشرے کو طاعوت کی غلامی سے نجات دلائے تاکہ لوگ طاعوت کی اطاعت کو چھوڑ کر خدا کی اطاعت میں داخل ہو جائیں۔

قرآن نے کفر کے اماموں سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے^۳ یعنی آخری مقابلہ کفر کی قیادت و رہبریت ہونا چاہئے تاکہ کفر ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائے و گرنہ فقط کفر کے ایجنٹوں سے مقابلہ کرنے یا خاتمہ کرنے سے کفر کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کفر کی قیادت سے ہو جاتا ہے اور اگر وہ اس مقابلے میں سرخرو ہو جائیں تو پھر ان کے زمانے میں کفر کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مقابلہ ہے جو اسلام کی نگاہ میں مقدس ہے اور اس کی خاطر جان بھی قربان کی جاسکتی ہے۔ اس اعتبار سے ایک الہی قیادت و رہبریت کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ اسے اس جنگ کی قیادت بھی کرنی ہے جو کفر کے لیڈروں سے ہوتی ہے اور جس میں عالم کفر اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ وارد میدان ہوتا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ دین اسلام ہر سطح پر ایمان باللہ کی اہمیت پر کیوں زور دیتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں اہل حق کی تعداد کم اور وسال محدود رہے ہیں ایسے میں ایمان ہی کے

^۱سورہ بقرہ ۲۵۷

^۲سورہ نحل ۳۶

^۳فَقَاتِلُوا أُمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَا آيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ (سورہ توبہ ۱۲)

سہارے کفر اور طاغوت کے رہنماؤں سے مقابلہ ممکن ہے۔ پس قرآن کے مطابق الٰہی قیادت کی سب سے بڑی پہچان اللہ پر ایمان ہے اور وہ خدا کی خاطر جہاد کرتے ہیں جبکہ کفار و مشرکین طاغوت کی خاطر لڑتے ہیں۔

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ
الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا^۱

قرآن نے انبیاء علیہم السلام کو اپنی اپنی امتوں کے لیے قائد و رہبر کے طور پر پیش کیا ہے اور انہیں اپنی اپنی امتوں کے لیے اسوہ حسنہ قرار دیا ہے۔ یہ سب ہادیان برحق ایمان کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز نظر آتے ہیں۔ ان کی کامیابی درحقیقت ان کے ایمان باللہ کی کامیابی ہے نیز وہی لوگ جو اس معاشرے میں ایمان کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز تھے ان کے ساتھی بنے۔ کمزور ایمان والے لوگ اور شکوک و شبہات میں مبتلا لوگ انبیاء کی تحریک میں پیش پیش نظر نہیں آتے۔ بعض اوقات قرآن نے انبیاء کے علاوہ بھی کچھ کردار بیان کیے ہیں مثلاً ایک مثالی قیادت کے طور پر جناب طالوت کو پیش کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ
الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ
اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكُهُ مَن
يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ^۲

یہاں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ طالوت کو علم اور جسم کی بنیاد پر برتری دی گئی اور ان کے پاس زیادہ مال نہیں تھا۔ پس یہ دونوں صفات یعنی علم میں برتری اور جسمانی شجاعت قیادت و رہبریت کے دو اہم ستون ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ لفظ جسم یہاں شجاعت کے لیے کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے البتہ پہلے زمانے میں جنگ و جدل کے لیے انسان کا جسمانی طور پر طاقتور ہونا بھی ضروری ہوتا تھا ہتھیار اور سواری قوت و طاقت ہی کے ذریعے موثر طور پر استعمال کیے جاسکتے تھے۔ اب زمانہ بدل چکا ہے اور جسمانی طاقت کی جگہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے لے لی ہے تاہم جب تک قیادت و رہبریت میں شجاعت نہیں ہوگی فقط ٹیکنالوجی سے مقابلہ جیتا نہیں جاسکتا۔ بزدل قیادت کبھی جرات مندانہ فیصلے نہیں کر سکتی خاص طور پر جہاں جان و مال کو خطرات بھی درپیش ہوں تو وہ ہمیشہ مصلحت پسندی کا شکار ہوگی اور اپنے مخالفین سے اپنے دل میں خوف محسوس کرے گی۔

اس آیت سے یہ نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ لفظ علم کو پہلے اور جسم کو بعد میں رکھا گیا ہے جس سے طاقت کے مقابلے میں علم کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب اپنے درباریوں کے سامنے تخت بلقیس کو لانے کا حکم دیا تو قرآن کریم کے مطابق ایک عفریت نے کہا کہ وہ دربار برخواست ہونے سے قبل تخت بلقیس کو حاضر کر سکتا ہے کیونکہ وہ قوی و امین ہے:

قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ (۳۸) قَالَ عِفْرِيْتُ مِنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ (۳۹) قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رآه مُسْتَقَرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي لِيَبْلُوَنِي أَأَشْكُرُ أَمْ أَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ (۴۰) ^۱

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قوی کے لیے بھی امین ہونا ضروری ہے ورنہ اپنی طاقت و قوت کی مدد سے خیانت بھی کر سکتا ہے تاہم اگر اس کے مقابلے میں اہل علم موجود ہوں تو پھر ان کو برتری حاصل ہوگی۔ آیت نے یہ بھی بتا دیا کہ کتاب کا تھوڑا سا علم بھی عفریت پر بھاری ہوتا ہے۔ پس اہم ذمہ داری اسی کو دی جائے گی جس کا علم زیادہ ہو۔ ایک الہی معاشرے میں جاہل کو کسی بھی اہم ذمہ داری پر فائز نہیں کیا جائے گا اس میں تو کوئی دورائے نہیں۔

اسلام علم کو بہت اہمیت دیتا ہے اور قرآن کریم میں جا بجا اس بات کی تصریح کر دی گئی ہے۔ کہیں کہا گیا ہے کہ عالم اور جاہل برابر نہیں ہوتے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ قُلِ اللَّهُ يَهْدِي لِلْحَقِّ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ أَمْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ يُهْدَىٰ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ^۲

ایک الہی رہبر کے لیے فقط یہ کافی نہیں کہ وہ عالم ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معلم ہو کیونکہ معاشرے میں علم کے فروغ میں بھی اس کو کردار ادا کرنا ہے جیسا کہ خداوند عالم نے اپنے رسول کے لیے فرمایا:

مطالعہ قرآن
شمارہ: ۵، جلد: ۳، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ^۱

علم کی اہمیت سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تاہم یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ علم مقصود بالذات نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہے جبکہ اس کے مقابلے میں تقویٰ مقصود الہی ہے اور وہ ہر اہم ذمہ داری کی بنیاد ہے۔ علم اگر تقویٰ کے بغیر ہو تو پھر وہ آفت ہے۔ پس قیادت و رہبریت کے لیے تقویٰ ضروری ہے بلکہ تقویٰ کا ایک اعلیٰ درجہ درکار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان، علم اور شجاعت کے بعد جتنی بھی صفات و خصوصیات ہیں وہ سب تقویٰ کے ذیل میں آتی ہیں۔ مثلاً تقویٰ کے بہت سے تقاضے ہیں ان میں سے ایک استقامت ہے۔ قیادت اور استقامت لازم و ملزوم ہیں اور قرآن کریم میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا
وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ^۲

فرشتوں کا نزول خواہ مومن کے قلبی سکون کے لیے ہو یا جنگ بدر کی طرح فتح کی نوید بن جائے دونوں صورتوں کے لیے ایمان اور استقامت کی شرط ہے۔ علامہ اقبال نے اس بات کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو

اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

قرآن کریم کے مطابق ہر مومن کی ذمہ داری ہے کہ وہ مستضعفین کی حمایت کرے۔ مستضعفین وہ مظلوم ہیں جن کو کسی سازش یا ظلم کے ذریعے کمزور کر دیا گیا ہے اور اب وہ اس طرح بے بس ہیں کہ ظالموں کا مقابلہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ ایک عام مسلمان کو بھی ان کی پشت پناہی کا حکم دیا گیا ہے پس ایک الہی قیادت و رہبریت کا فرضہ حمایت سے کہیں زیادہ ہے یہاں تک کہ قرآن کریم جن مواقع پر کسی سے جنگ کرنے کو لازمی قرار دیتا ہے ان میں سے ایک مقام مستضعفین کی مدد و نصرت ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ
وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ
لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا^۱

قرآن کے مطابق قائد و رہبر کو اخلاق پسندیدہ کا حامل ہونا چاہئے تاکہ لوگ اس کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر اس کے گرد جمع ہوں اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری کریں۔ بد اخلاق اور بد کردار لوگوں سے لوگ متنفر ہوتے ہیں اور ان سے دور بھاگتے ہیں قرآن کریم نے رسول اکرم کے لیے فرمایا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ^۲

قیادت و رہبری کے لیے تواضع و بردباری بھی ایک بنیادی شرط ہے اور یہ بھی تقویٰ کا ہی تقاضہ ہے کیونکہ خداوند عالم کو تکبر پسند نہیں ہے۔ تکبر کا معنی خود کو بڑا سمجھنا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ کوئی بھی مخلوق خدا کے سامنے بڑی نہیں ہے اسی لیے خدا کو یہ پسند ہے کہ انسان متکبر ہو، شیطان کے لیے کہا گیا ہے کہ **أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ** (اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہو گیا)۔^۳ بڑا صرف خدا ہے اور اسی کو تکبر کرنا زیب دیتا ہے۔ انسان کے لیے یہی سب سے بڑی بات ہے کہ وہ عبد بن جائے۔ محمد رسول اللہ ﷺ بھی عبد تھے اور عاجزی اور انکساری کے پیکر تھے۔ ہر دور میں قیادت و رہبریت کے دعویدار کو تواضع اور انکساری کا اظہار کرنا ہو گا پھر تو وہ کامیاب ہو گا ورنہ تکبر کرنے والے کا انجام شیطان اور فرعون والا ہوتا ہے۔

اسلام اور قرآن کی نگاہ میں قائد و رہبر کے اندر سوزدروں یا درد دل ہونا چاہئے اور اپنی امتوں کے لیے خیر خواہی ہونا چاہئے۔ انبیاء علیہم السلام کی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی امتوں کے لیے اس قدر سوز و گداز رکھتے تھے کہ ان کی غلط کاریوں کے باوجود ان کے لیے عذاب الہی طلب نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ جب بات انتہا کو پہنچ جاتی تھی تو پھر عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو اللہ نے چالیس سال تک بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ ان کے ساتھ رہے۔ عیسیٰ علیہ السلام اپنی مشرک امت، جنہوں نے ان کو اللہ کا بیٹا بنا دیا اور عبادت شروع کر دی، کے لیے بھی خدا سے در پردہ سفارش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

^۱سورہ نساء ۷۵

^۲سورہ آل عمران ۱۵۹

^۳سورہ بقرہ ۳۴

وَأِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّي إِلهَيْنِ
 مِنْ دُونِ اللَّهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقِّ إِنْ
 كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعَلَّمَ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ
 أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ (۱۱۶) مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ
 رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتُ
 أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۱۱۷) إِنْ تُعَذِّبُهُمْ
 فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَعْفُزْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱۱۸)'

رسول اکرم ﷺ کی توکیا بات ہے کہ خداوند عالم ان کے لیے فرماتا ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسِكَ إِلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ^۲

یہاں باخع سے مراد یہ ہے کہ گویا اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے تاکہ کسی طرح یہ لوگ مومن
 ہو جائیں یہ ایک قائد و رہبر کی اپنی قوم سے عشق و محبت کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ کس طرح اپنی قوم کی فلاح چاہتا
 ہے اور اس کی خاطر کہاں تک جاسکتا ہے۔

قیادت و رہبری کے لیے وسعت قلبی ضروری ہے۔ تنگ دل انسان اسلام کی نگاہ میں رہبریت کے
 لیے اہل نہیں ہے کیونکہ وہ پوری امت کا امام ہوتا ہے اور اس کے دل میں امت کے ہر فرد کے لیے گنجائش
 ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں پیغمبر اکرم کے لیے خداوند عالم فرماتا ہے: أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ^۳ کیا ہم نے
 آپ کے کو شرح صدر عطا نہیں کیا؟ ایک الہی رہبر کبھی قوم پرستی یا فرقہ پرستی میں نہیں پڑتا وہ تو پوری انسانیت
 کی بات کرتا ہے۔ اللہ نے اپنے رسول کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا، قرآن کو پوری انسانیت کے لیے ہدیٰ للناس
 بنایا۔ امام مہدی ع اللہ فرجہ شریف کی حکومت عالمی حکومت ہوگی اور وہ پوری انسانیت کے لیے نجات دہندہ بن
 کر آئینگے۔ ان کی غیر موجودگی میں بھی امت کے رہبر و قائد کو عالمی سوچ کا حامل ہونا چاہئے۔ تنگ نظری کے
 ساتھ یہ کام نہیں ہو سکتے۔

رہبریت کے لیے عدالت خواہی اور انصاف پسندی ضروری ہے۔ ظالم کے لیے تو امامت ثابت نہیں
 ہے جیسا کہ خداوند عالم نے حضرت ابراہیم سے فرمایا: لَا يَنَاؤُ الْعَهْدِي الظَّالِمِينَ^۴ یہ عہدہ امامت ظالموں

^۱سورہ مائدہ ۱۱۶ تا ۱۱۸

^۲سورہ شعرا ۳۱

^۳سورہ انشراح ۱

^۴بقرہ ۱۲۳

تک ہر گز نہیں پہنچے گا۔ پس قرآن کریم کے مطابق قیادت و رہبری کے لیے عدل و انصاف کا خوگر ہونا ضروری ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے منسوب ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم، حکومت کفر کے ساتھ تو چل سکتی ہے لیکن ظلم کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ محققین نے اس کے حدیث ہونے سے انکار بھی کیا ہے اور بہت سے علماء نے اس کو قبول بھی کیا ہے تاہم یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ کفر کی حکومت اگر عدل و انصاف برقرار رکھے تو پائیدار ہوتی ہے لیکن ظلم کی عمر کم ہوتی ہے۔ ایک الٰہی رہبر کبھی ظلم کے نظام کو پسند نہیں کرتا بلکہ ظلم کے خلاف بغاوت کرنا پناہ فرضہ سمجھتا ہے۔ یہ تو کسی طور پر بھی ممکن نہیں کہ کوئی الٰہی رہبر ظلم کے نظام کا حصہ بنے یا اس کا آلہ کار بنے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ظانغوی نظام ہے اور وہ طانغوت سے جنگ کرنے والا۔

رہبر و قائد کے لیے فقط یہ کافی نہیں کہ وہ ظالم نہ ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے کے لوگوں کو ظلم کی چکی سے نجات دلائے اور ان پر پڑی ہوئی ظلم و ستم نیز جہالت و توہمات یا کفر و شرک کی زنجیروں کو اتار پھینکے اور انہیں خرافات سے نجات دلائے۔ یہ بات اس آیت میں کہی گئی ہے:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْنُوبًا عِنْدَهُمْ فِي
التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَمَجْلُ لَهُمُ
الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي
كَانَتْ عَلَيْهِمْ^۱

قرآن کریم تو انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی عادلانہ معاشرے کا قیام بتاتا ہے اور کہتا ہے:

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ
بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ
يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ^۲

اسلام میں قیادت و رہبری کے لیے جو ہدایات آئی ہیں ان میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ اصولوں پر شدت پسندی کا مظاہرہ کرنے والا ہوتا ہے اور کبھی بھی اصولوں پر سودے بازی نہیں کرتا اور مصالحت کی کوئی کوشش ممکن نہ ہو تو پھر قاطعیت کے ساتھ اعلان کر دیتا ہے: لَكُمْ دِينُكُمْ وَ لِي دِينِ^۱

ایک الٰہی رہبریت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اہل ایمان اور مخلص ساتھیوں کے لیے نرمی اور عاجزی کا مظاہرہ کرتا ہو لیکن جب دشمنان اسلام کا سامنا ہو تو پھر شدت پسندی کا مظاہرہ کرتا ہو۔ قرآن کریم واضح طور پر اعلان کر رہا ہے:

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رِحَمَاءٌ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا^۲

علامہ اقبال نے اس بات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے:

ہو حلقہ یاراں تو ابریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اسلام میں کسی بھی عہدے پر فائز ہونے کے لیے مندرجہ بالا صفات و خصوصیات کے ساتھ ساتھ حسن تدبیر یعنی اہلیت ضروری ہے۔ نا اہل اور بے صلاحیت افراد کو ہرگز کوئی عہدہ نہیں دیا جائے گا خواہ اس کا علم اور تقویٰ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکل کر مدین پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ ایک کنویں میں اپنی مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں اور وہیں دو لڑکیاں اس انتظار میں ہے کہ ان کی باری آئے۔ حضرت موسیٰ نے ان کی مدد کی تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دعوت دی کہ وہ ان کے والد حضرت شعیب علیہ السلام سے ضرور ملاقات کریں۔ جب موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام سے ملے تو ان لڑکیوں میں سے ایک نے کہا:

قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ^۳

اے بابا ان کو اجیر بنا لیجئے کیونکہ بہترین اجیر وہی ہوتا ہے جو قوی بھی ہو اور امین بھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لڑکیوں کو کیسے پتہ چلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قومی اور امین ہیں۔ جواب واضح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جس طرح ان لڑکیوں کی مویشیوں کو پانی پلویا اور لوگوں کو کنویں کے پاس سے ہٹایا وہ ان کی قوت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا اور جب یہ لڑکیاں اپنے والد کے پاس واپس جا رہی تھیں اور موسیٰ علیہ السلام ان کے پیچھے چل رہے تھے تو موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوا کہ ان کی نگاہیں ان لڑکیوں کے وجود پر پڑ رہی ہیں جو غیر مناسب ہے پس انہوں نے کہا کہ میں آگے آگے چلتا ہوں اور تم دونوں مجھے پیچھے سے راستہ بتاؤ۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امانتداری کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ یہیں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کے مطابق اہم ذمہ داریاں اس کو دی جانی چاہئے جو قومی یعنی اہل ہوا اور امین یعنی امانتدار ہو۔ قیادت و رہبری بھی انتہائی ذمہ داری کا کام ہے پس اس کے لیے بھی قومی یعنی اپنی تمام ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھنے والا اور امین یعنی قوم کی امانت جو اس کے پاس مال و دولت کی شکل میں ہے یا عزت و ناموس کی شکل میں اس میں خیانت کرنے والا نہ ہو اگر ایک مرتبہ بھی اس کی موئی معمولی خیانت بھی سامنے آجائے تو وہ نااہل ہو جائے گا۔

قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ بھی ہے جس میں عزیز مصر نے جب چاہا کہ ان کو اہم ذمہ داری عطا کرے تو انہوں نے خود فرمایا:

وَقَالَ الْمَلِكُ اِثْنَيْنِ بِهِ اَسْتَخْلِصُهُ لِنَفْسِي فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ
لَدَيْنَا مَكِينٌ اَمِيْنٌ (۵۴) قَالَ اجْعَلْنِي عَلٰى خَزَائِنِ الْاَرْضِ اِنِّي خَفِيْظٌ
عَلِيْمٌ (۵۵)^۱

حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنی خوبی گنونا دراصل شرائط کو واضح کرنا تھا کہ جس شخص کو اہم ذمہ داری دی جا رہی ہے اس کا ذمہ دار اور قابل ہونا ضروری ہے۔ قیادت و رہبری بھی ایک اہم ذمہ داری ہے اس لیے بدرجہ اتم حفیظ یعنی بہت زیادہ حفاظت کرنے والا اور علیم یعنی بہت زیادہ علم رکھنے والا ہونا چاہئے۔

یوں تو اسلام میں قیادت و رہبری کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے تاہم قائد و رہبر کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ اجتماعی معاملات میں مشورہ کرے اور قرآن کریم اس بارے میں واضح طور پر بیان کرتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ وِمَا
رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ^۱

قیادت و رہبریت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر فصاحت و بلاغت ہو تاکہ وہ اپنی بات موثر انداز سے کر سکے تاکہ لوگوں کے دلوں میں اتر جائے اور جدال میں کامیابی حاصل ہو۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے:

أَذْهَبَ إِلَيَّ فِرْعَوْنُ إِنَّهُ طَعَنِي (۲۴) قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي (۲۵)
وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي (۲۶) وَأَحْلِلْ غُمَّةً مِنِّي لِسَانِي (۲۷) يَفْقَهُوا قَوْلِي (۲۸)^۲

الہی قیادت و رہبریت کے لیے بصیرت نہایت ضروری ہے کیونکہ قدم قدم پر جن معاملات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس میں بصیرت کے ساتھ سمجھنا اور فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ بصیرت سے مراد دینی بصیرت بھی ہے اور سیاسی و اجتماعی بصیرت بھی۔ بے شک وہ دیگر بصیرت ساتھیوں سے مشورہ بھی کر سکتا ہے تاہم حتمی فیصلہ تو اسے ہی کرنا ہوتا ہے اس لیے بصیرت کے بغیر معاملہ نہیں چل سکتا پس ایک الہی رہبر کے لیے جہاں مندرجہ بالا اور بہت سی خوبیاں ہونی چاہئے وہیں بصیرت کی بھی ضرورت ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آیا ہے:

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ
وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ^۳

منابع

۱. قرآن کریم
۲. نخب البلاغہ

^۱سورہ شوریٰ ۳۸

^۲سورہ طہ ۲۸۵

^۳سورہ یوسف ۱۰۸

قرآنی و غیر قرآنی اسلوب زندگی کا تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر سعید احمد سعیدی*

غلام محی الدین**

انسان اپنی تخلیق کے تمام مراحل میں قدرت کی فیاضی کا مرہون منت ہے، اس احتیاج کا سلسلہ روح کی تخلیق سے شروع ہو کر باپ سے ماں کے رحم تک پہنچتا ہے اور پھر خالق کائنات جملہ صلاحیتوں سے نواز کر اس دار فانی میں ظہور عطا فرماتا ہے۔ پھر ان صلاحیتوں کے نکھار کا تعلق مختلف شخصیات اور اداروں سے جڑ جاتا ہے۔ قدرت کے شاہکار اس ہیرے کو جتنا تراشا جائے اتنا ہی قیمتی ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت جس قدر عمدہ ہوگی، معاشرے کو اسی قدر مہذب و منظم شخصیت مہیا ہوگی۔

چونکہ انسان کی جملہ خواہیدہ صلاحیتیں اللہ جل شانہ کی ہی کردہ ہیں لہذا ان کی بیداری کا اسلوب وہی مناسب ہو سکتا ہے جو اس مالک ارض و سماء نے عطا فرمایا، اسی کا دیا ہوا قانون انسانی زندگی کی خوش اسلوب تشکیل میں بنیادی کردار ادا کر سکتا ہے، وہ صحیفہ انقلاب قرآن ہے جس کا نزول معلم انسانیت ﷺ کے قلب مطہر پر ہوتا ہے۔ اسی کلام ربانی کو لے کر آپ نے ایک مختصر ترین عرصہ میں انسانی زندگی کا رخ پلٹ کر رکھ دیا۔ صحابہ کرام کی معطر زندگیاں اس کی بہترین مثال ہیں۔ اس اہمیت کے پیش نظر اس تحقیقی مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ ان پوشیدہ اسرار و رموز کو احاطہ تحریر میں لایا جائے جو قرآنی اسلوب زندگی کی تشکیل میں مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف شواہد اور دلائل کی روشنی میں قرآنی اور غیر قرآنی اسلوب زندگی کا تقابل بھی پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

کلیدی الفاظ: تخلیق انسانی، صلاحیتیں، مہذب، انسانی زندگی، صحیفہ انقلاب، صحابہ کرام

انسان وجود کی نعمت پا کر بہارِ آخریں دنیا میں برسوں اپنا مقسوم پانا اور اس کی ہجرت و رونق میں اپنا کردار ادا کرنا معمولی بات نہیں اور احسان در احسان یہ کہ کوئی دوسرا وجود اپنی حیات و شعور کے باوصف اس انسان کی عظمتوں کے ہالے کو بھی نہ چھو سکا۔ یہ بات سب پر عیاں ہے کہ اس پیکرِ عنائی و دلبری کا وجود اور اس کی

* چیئر مین شعبہ علوم اسلامیہ و عربی، لاہور گریشن یونیورسٹی، لاہور

** پی ایچ ڈی۔ کالر، لاہور گریشن یونیورسٹی، لاہور